پروفیسر سید نقی حسین جعفری*

تہذیبوں کا ٹکراؤ
یا امریکی استعمار کا پیش خیمہ؟

''تہذیبوں کے ٹکراؤ'' کے عنوان سے سیموئل ہن ٹنگ ٹن نے اپنا مقدمہ "Foreign Affaris" نامی جنرل میں 1993 میں پیش کیا تھا۔ بعد میں یہی مقدمہ (Thesis) مزید وضاحتوں اور اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں "The Clash of Civilization and the Remaking of World Order" ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔ اس میں بنیادی مفروضات کی نئی ترتیب اور معلومات ہیں۔ اس کتاب کے پانچ حصے ہیں: (۱) تہذیبوں کی دنیا۔ (۲) تہذیبوں کے بدلاؤ کا نقطہ ارتکاز (۳) تہذیبوں کی ترتیب نو۔ (۴) تہذیبوں کا ٹکراؤ اور (۵) تہذیبوں کا مستقبل۔

پہلے باب میں مؤلف کا استدلال ہے کہ عالمی سیاست پہلی بار "Multipolar" اور "Multi Civilizational" بننے کے مراحل سے گزر رہی ہے۔ اور دوسری بات یہ کہ جدید کاری "Modernization" تقلید مغرب "Westernization" سے مختلف چیز ہے۔ دوسرے باب میں مولف نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ تہذیبوں کے مابین قوت کا تناسب بدل رہا ہے اور مغربی دنیا کا اثر کم ہو رہا ہے جب کہ اسلام کی اشاعت میں اضافے کے باعث مسلمانوں کی قوت میں اضافہ ہوا ہے اور یہ بات مسلم ممالک کے پڑوسیوں کے لئے خطرناک ہے۔ تیسرے باب میں تہذیبی بنیادوں پر عالمی برادری کی ترتیب نو سے بحث کی گئی ہے اور یہ مفروضہ پیش کیا گیا ہے کہ یہ ترتیب نو "Core" ممالک کی مرکزیت کے حوالے سے ہوگی۔ چوتھے باب میں مغربی تہذیبی وحدت کے مدمقابل اسلام اور چین کو پیش کیا گیا ہے۔ اس باب میں ان خطرات سے بھی بحث کی گئی ہے جو مسلم اور غیر مسلم ممالک کے درمیان سرحدی تنازعات کو لے کر سامنے آئیں گے۔ پانچویں اور آخری باب میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ مغربی امریکی تہذیب کی بقاء کا دارومدار اس میں مضمر ہے کہ وہ اپنی شناخت قائم رکھیں اور اپنے نظام اقدار کو بے مثال تو سمجھیں لیکن اسے عالمی نہ سمجھیں۔ یعنی انہیں یہ بھول نہیں کرنی چاہیے کہ ان کا ''نظام اقدار'' کبھی بھی ''عالمی'' بن سکتا ہے۔ بعد میں یہ بھی

* انگلش ڈیپارٹمنٹ جامعہ ملیہ اسلامیہ منیجر خدیجہ الکبریٰ گرلس سیکنڈری سکول نئی دہلی

کہا گیا کہ آئندہ عالمی جنگ سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ عالمی قیادت یہ تسلیم کرے کہ بقائے باہم اور تعاون میں ہی عافیت ہے اور یہ کہ دنیا ایک مخصوص تہذیب سے عبارت نہ ہو کہ کثیر الجہات تہذیبی ورثے سے پہنچانی جائے گی۔

تین سال کے فرق سے لکھی گئی یہ کتاب اصولی طور پر پرانے مقدمے "Thesis" سے مختلف نہیں ہے۔

اس مدت میں سیاسی طور پر سب سے اہم سلسلہ واقعات بوسنیا کا مسئلہ اور اس ضمن میں روس کی پشت کے قیام کی مخالفت شدومد سے جاری رہی۔ سابق یوگوسلاویہ کی خانہ جنگی بالآخر تین نئی ریاستوں بوسنیا ہرزیگونیا کے نام سے بنی۔ سب سے زیادہ خون خرابہ بوسنیا کے نام پر ہوا اور یوروپی نظام اقدار کا بھرم ٹوٹ گیا۔ اس مسئلہ پر صدر کلنٹن کی سخت روش اور ناٹو "Nato" جیسی فوجی تنظیم نے بوسنیا کے قیام کو ممکن بنا دیا۔ ہن تنگ ٹن جدید عالمی تہذیب کو ہم قطبی "Multipolar" اور کثیر الجہات مانتے ہوئے بھی مغربی امریکی تہذیبی برتری کے خیال کو ترک نہیں کرتا۔ وہ اپنے تجزیہ میں کہتا ہے: ''جو امور مغربی دنیا کو باقی دنیا سے الگ کرتے ہیں اور جن کی بڑھتی ہوئی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا وہ تین امور حسب ذیل ہیں:

(۱) مغرب کو ہر صورت میں اپنی فوجی برتری قائم رکھنی ہے اور اس سلسلے میں ایٹمی توانائی کے حصول سے دوسرے ملکوں کو دور رکھنا ضروری ہے۔ (۲) مغربی سیاسی اقدار اور اداروں کو مقبول بنایا' مغربی طرز کی جمہوری حکومت کے فروغ اور حقوق انسانی کا وہ تصور جیسا کہ مغرب میں ہے دوسرے تک پہنچانا اور (۳) مغرب کی نسلی' سماجی' اور ثقافتی شناخت کی حفاظت اور اس ضمن میں ایشیائی اور افریقی ممالک سے ہجرت کرنے والوں کی تعداد پر مناسب کنٹرول۔ ان تینوں میں مغرب کو دشواریوں کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

بالفاظ دیگر فوجی اور معاشی بالادستی' مغربی سیاسی اقدار کا فروغ اور مغربی طرز کی جمہوری حکومتوں کے قیام پر اصرار اور مغربی نسلی' سماجی اور ثقافتی شناخت کا تحفظ اور ان مقاصد کے حصول کے لئے جنگیں اور بدترین فوجی کارروائی جیسا کہ ہم نے افغانستان اور عراق میں دیکھا ہے۔ اور سطحی طور پر یہ راگ بھی الاپا جائے کہ دنیا ہمہ قطبی "Multipolar" اور کثیر الجہات تہذیبوں سے عبارت ہے اور بقائے باہم کے اصولوں پر عمل ہونا چاہیے۔ دونوں باتوں میں کتنا فاصلہ اور اجتماع ضدین ہے۔ لیکن کیا کیا جائے؟ امریکہ کو اتنا بااختیار اور قوی بنانے میں ہمارے آپسی تضادات اور اختلافات کو بھی دخل ہے۔

مسلمانوں کے بارے میں بالعموم اور عربوں کے بالخصوص جیسی سطحی واقفیت منصف کی پہلے مضمون سے ظاہر تھی' ویسی ہی اس کتاب میں ہے۔ وہ جدید تہذیب کے خط وخال کو سمجھنے میں لاطینی اور رومن سلطنت تک تو پہنچتا جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد یوروپی نشاۃ ثانیہ اور جدید تہذیب تک پہونچ جاتا ہے رومن تہذیب کے زوال اور یورپی نشاۃ ثانیہ کے آغاز کے درمیان ہزار سال کے بارے میں مولف کچھ کہے بغیر آگے گزر جاتا ہے۔ عربی زبان اور عرب

تہذیب تمدن کا ذکر اگر آتا ہے تو بہت سطحی اور سرسری۔ ہن ٹنگ ٹن اس حقیقت سے کیسے ناواقف ہوسکتا ہے کہ ساتویں صدی سے چودھویں صدی تک عربی زبان کی حیثیت "Franca "Lingua یعنی عالمی علمی زبان کی تھی اور دنیا کا سارا علم عربی زبان میں موجود تھا۔ اس ایک ہزار سالہ علمی ورثہ کو صرف تنگ نظر مورخین نظر انداز کرتے ہیں یا سرسری ذکر کرتے ہیں۔ آج کل ہندوستان کی بعض یونیورسٹیوں میں عہد وسطیٰ کی تاریخ نہیں پڑھائی جاتی۔ عذر یہ پیش کیا جاتا ہے کہ فارسی جاننے والے لوگ نہیں ملتے۔ اسی طرح پاکستان میں قدیم ہندوستانی تاریخ کو بھی عرصہ تک پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ یہ روئے غیر علمی اور تعصب پر مبنی ہیں۔ ہن ٹنگ ٹن بھی اس کا مرتکب ہے' لیکن یہ صرف تساہلی اور مؤخذ سے ناواقفیت کا معاملہ نہیں ہے' یہ مسلمانوں کے علمی ورثے کو دانستہ طور پر نظر انداز کرنے کی بات ہے تاکہ اس دور کے بعض مفروضات کو جو جہالت اور غفلت پر مبنی ہیں استحکام دیا جائے۔

"Karl H.Dannenfeldt" کا مضمون بعنوان "Renaissance Humanists the Knowledge of Arabic" جو "M.A Shaaber" کی ترتیب دی ہوئی کتاب میں شامل ہے اور جسے "Renaissance Society of Amrica" نے ۱۹۵۵ء میں شائع کیا ہے' مختلف علوم کے یورپین ماہرین کی عربی دانی کے بارے میں سند کے ساتھ معلومات فراہم کرتا ہے۔

عرب ممالک کے سیاسی نظام کی گرفت ہن ٹنگ ٹن نے ضرور کی ہے اور بڑی حد تک درست بھی ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد عرب ممالک میں خاندانی بادشاہت کے علاوہ جو نظام مقبول ہوا وہ سوویت طرز کا تھا۔ جس میں پارٹی کی حکمرانی ہوتی ہے۔ یہ نظام عراق' شام' مصر' الجزائر' یمن اور بعض دوسرے ممالک میں قائم ہوا' لیکن یہی نظام مشرقی یورپ میں بھی تھا جو سوویت یونین کے زیر اثر تھے۔ ہن ٹنگ ٹن اپنی کتاب میں نئے نظام کے عنوان سے لکھے گئے باب میں مشرقی یورپ کو تو آسانی سے مغربی تہذیب میں شامل کرتا ہے' لیکن عرب ممالک کو اس سے خارج کر دیتا ہے۔

گزشتہ شماروں میں ہم نے عرب ممالک کے سیاسی نظام کی کمزوریوں کی نشاندہی کی تھی' لیکن وہاں کچھ ایسی خصوصیات ضرور ہیں جن کی وجہ سے سیاسی نظام معاشرے پر زیادہ حاوی نہیں ہو پاتا۔ ان میں سب سے ممتاز خاندان کا تصور ہے۔ اسی تصور کی وجہ سے بزرگوں اور بڑے بوڑھوں کی جتنی تکریم عرب ممالک میں ہے' دنیا میں کہیں نہیں ہے۔ "Rule of Law" تو نہیں ہے کہ اس کی ذمے داری ریاست پر عائد ہوتی ہے لیکن شریعت پر عمل کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ ذاتی زندگی اور خاندانی زندگی میں حرام اور حلال کی تمیز' زکوٰۃ کا نظام' وراثت کی تقسیم اور قرآنی علوم اور مکتب تک کی تعلیم کا نظام پورے عالم عرب میں قائم ہے۔ حکومت کسی قسم کی ہو' سیاسی نظام جیسا بھی ہو' عرب معاشرے کی بنیادی قدریں نہ ختم ہوسکتی ہیں اور نہ اس میں کسی قسم کی کمی آسکتی ہے۔

مغرب میں الجزائر سے مشرق اقصیٰ میں انڈونیشیا تک اور وسط ایشیا سے وسطی افریقہ تک عرب اسلامی

تہذیب ایسے تناظرات کی حامل ہے جو یقیناً توجہ طلب ہے۔ اگر کبھی ریاستی جبر سے آزاد کسی معاشرے کا خیال آتا ہے تو وہ معاشرہ اسی خطے میں تصور کیا جاسکتا ہے' خاندان کی وحدت اور خاندانی اقدار "Family Values" جیسی اس مطلقے میں نظر آتی ہیں دنیا کے دوسرے حصوں میں نہیں۔ دوسری تہذیبیں مغربی نظام میں خاندان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کے اثرات کو روکنے سے قاصر نظر آتی ہیں۔ جبکہ عرب اسلامی تہذیب خاندانی اقدار کو باقی رکھنے میں پوری طرح کامیاب ہے۔ مسجد سے ملحق مدرسہ اور مکتب نے خواندگی اور بعض بنیادی تعلیمی صلاحیتوں کا اجاگر کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو انگریزی کی بالادستی اور ہندوستان میں بالخصوص اردو کیساتھ سوتیلے پن کے برتاؤ کے نتیجے میں مسلمانوں میں خواندگی کی شرح جتنی ہے اس کی آدھی بھی نہ ہوتی۔ خاندانی اقدار کی بقا بزرگوں کے اکرام کی ضمانت ہے۔ متحدہ خاندان' شہروں میں بھلے ہی زوال پذیر ہے' لیکن قصبات اور گاؤں میں اسکے باوصف بہت سی اقدار باقی ہیں۔ بڑی حد تک انسانی معاشرے میں عرب اسلامی تہذیب نے ''حیا'' کے تصور کو زندہ رکھا ہے اور مرد اور عورت کے رشتے کی پاکیزگی پر اصرار سے دنیا کو بڑی معصیت سے بچایا ہے۔ آزادانہ جنسی اختلاط کے نتیجے میں پیدا ہونے والے امراض جسے آج کل "Aids" کے نام سے جانا جاتا ہے' مسلم معاشرے میں یا تو نہیں کے برابر ہیں یا بہت کم۔

اسی طرح زکوٰۃ کے نظام سے ہزاروں بلکہ لاکھوں مفلوک الحال لوگ مستفید ہوتے ہیں اور سماج کی ایک بڑی ضرورت پوری ہوتی ہے۔ ان چند وضاحتوں سے صرف یہ اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ریاستی ڈھانچہ نہ بھی ہو تو الجزائر سے انڈونیشیا تک انسانی معاشرہ حقوق اور فرائض سے بے پرواہ نہیں ہوسکتا۔ کبھی کبھی خیال آتا ہے کہ مسلم ممالک میں جو خرابیاں آئی ہیں وہ ریاستی جبر اور طرز حکومت کے نتیجے میں آئی ہیں۔ جسے لازماً عوام پر مسلط کیا جاتا ہے۔ ایک بات اور توجہ طلب ہے کہ ان ممالک میں عوامی اور معاشرتی زندگی تقریباً یکساں نظر آتی ہے خواہ وہاں بعث پارٹی کی حکمرانی ہو یا نام نہاد اسلامی حکومت۔ یعنی خاندانی اقدار' مسجد سے ملحق مدرسہ' زکوٰۃ کا نظام اور عمومی طور پر حقوق اللہ اور حقوق العباد کا شعور اور جوابدہی کا شعور اور جوابدہی کا خیال و پاس' چاہے شام کا کوئی شہر ہو یا سوڈان کی دیہی آبادی' سمرقند ہو یا انڈونیشیا کے جزیرے۔

حیرت ہوتی ہے کہ ہن ٹنگ ٹنیا اس جیسے کسی دوسرے کم علم اور کج فہم مصنف کی نظر ان حقائق پر نہیں جاتی۔ عراق جیسے قدیم ترین تہذیبی گہوارے کی قسمت کا فیصلہ صدام حسین کے کردہ اور ناکردہ اعمال پر کردیا جاتا ہے اور نتیجے میں لاکھوں بے گناہ موت کے گھاٹ اتار دیئے جاتے ہیں۔ ۱۱/ستمبر ۲۰۰۱ء میں امریکی تجارتی مراکز میں کئے گئے حملوں کا بدلہ افغانستان کے غریب اور غیور پٹھانوں سے لیا گیا جو کسی طرح بھی ان مراکز تباہی کے ذمہ دار نہ تھے۔ تہذیبی اقدار کی نمائندگی ارباب حکومت کے بجائے عوام میں دیکھی جانی چاہیے' ورنہ ہلاکو اور جارج بش میں کیا فرق رہ جائے گا؟ قارئین جانتے ہیں کہ ۱۲۵۸ء میں ہلاکو خان نے خلیفہ مستعصم باللہ کے کسی معمولی عمل یا رویے سے ناراض ہوکر بغداد پر حملہ کیا تھا اور ایک شہر ہی نہیں ایک تہذیب کو برباد کردیا۔